ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1911

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :دعوت و ارشاد • (1911) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ 6 تا(9

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

سوال نمبر :1 تدریج کا اصول :حضرت عائشہؓ کی روایت سے دعوتی رہنمائی 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں تدریج کے اصول سے کیا دعوتی رہنمائی ملتی ہے؟(20)

تعارف

دعوت کے اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول تدریج ہے، یعنی ہدایت اور اصلاح کو ایک دم لاگو کرنے کے بجائے انسانی استعداد کے مطابق درجہ بدرجہ آگے بڑھانا۔ اس اصول کی سب سے جامع دلیل ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ مشہور روایت ہے جو صحیح بخاری میں نقل ہوئی ہے، جس میں آپ نے قرآن کے نزول کی ترتیب بیان فرمائی۔ اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ پہلے مفصل کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و جہنم کا ذکر تھا؛ جب لوگ اسلام کی طرف پوری طرح مائل ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سب سے پہلے یہ نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے، اور اگر پہلے زنا کی ممانعت آ جاتی تو وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ اس جواب میں پہلے روایت کی تشریح، پھر اس سے حاصل ہونے والی دعوتی رہنمائی کے نکات بیان کیے جائیں گے۔

تدریج کو محض سستی یا تاخیر سمجھنا غلط ہے۔ تدریج دراصل انسان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر بنائی گئی وہ حکمت عملی ہے جس میں مقصد سے کوئی سمجھوتا کیے بغیر راستہ آسان بنایا جاتا ہے۔ شراب کی حرمت کا قرآنی سفر اس کی سب سے بڑی مثال ہے کہ پہلے اس کے نقصان کی طرف اشارہ ہوا، پھر نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے روکا گیا، اور آخر میں اسے قطعی طور پر شیطانی عمل قرار دے کر چھوڑنے کا حکم آیا۔ اسی طرح نماز، زکاۃ اور دیگر احکام بھی مختلف مراحل سے گزر کر اپنی مکمل صورت کو پہنچے۔ حضرت عائشہ کی روایت اس پورے نظام کی فلسفیانہ بنیاد فراہم کرتی ہے کہ بنیاد پہلے، عمارت بعد میں۔

روایت کی تشریح: پہلے عقیدہ و آخرت، پھر احکام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ مکی دور کی ابتدائی سورتوں کا مرکزی موضوع جنت و جہنم، قیامت اور جزا و سزا تھا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ جب تک انسان کے دل میں اللہ کی عظمت اور آخرت کی جوابدہی کا یقین نہ بیٹھ جائے، وہ کسی حکم کو بوجھ سمجھ کر چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ عقیدہ درخت کی جڑ ہے اور احکام اس کے پھل؛ جڑ کے مضبوط ہونے سے پہلے پھل کا مطالبہ بے سود ہوتا ہے۔ روایت میں آپ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ جب لوگ اسلام کی طرف رجوع کر چکے اور ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا، تب حلال و حرام کا باقاعدہ نظام نازل ہوا۔ اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی استعداد کا پورا لحاظ رکھا، حالانکہ وہ یکدم سب احکام نازل کرنے پر قادر تھا۔

روایت کا دوسرا نکتہ انسانی مزاحمت کی نفسیات کا بیان ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر پہلا حکم ہی شراب یا زنا کی مکمل ممانعت کا ہوتا تو لوگ کہتے کہ ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ اس جملے میں داعی کے لیے انتہائی قیمتی رہنمائی ہے کہ انسان عادت کا غلام ہوتا ہے؛ برسوں کی عادتیں ایک حکم سے ذہنی طور پر قبول تو ہو سکتی ہیں مگر عملی طور پر چھوڑنے کے لیے اسے وقت، دلیل، ماحول اور بدلے میں بہتر چیز درکار ہوتی ہے۔ جو داعی اس نفسیات کو نظر انداز کر کے پہلی ملاقات میں ہی سارے مطالبات سامنے رکھ دیتا ہے، وہ اکثر مخاطب کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس تدریجی داعی پہلے دل جیتتا ہے، پھر بتدریج اعمال کی اصلاح کرتا ہے۔

دعوتی رہنمائی :اصول اور نکات

اس روایت سے ملنے والی پہلی رہنمائی یہ ہے کہ دعوت کی ترتیب ہمیشہ عقیدے سے عمل کی طرف ہو۔ نئے مخاطب کے سامنے سب سے پہلے توحید، آخرت اور زندگی کے مقصد کی بات رکھی جائے، فقہی جزئیات اور اختلافی مسائل بعد کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ دوسری رہنمائی یہ ہے کہ مطالبات کو درجوں میں تقسیم کیا جائے :پہلے فرائض کی اہمیت، پھر حرام چیزوں سے بچاؤ، پھر مستحبات و اخلاقی کمالات۔ تیسری رہنمائی یہ ہے کہ داعی مخاطب کی استطاعت اور ذہنی آمادگی کو جانچ کر اگلا قدم اٹھائے؛ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت نبی کریم ﷺ نے بھی اسی ترتیب کی تلقین فرمائی تھی کہ پہلے توحید کی دعوت دینا، وہ مان لیں تو نماز، پھر زکاۃ کی طرف بلانا۔ یہ حدیث حضرت عائشہ کی روایت کی عملی تائید ہے۔

چوتھی رہنمائی صبر اور طویل المیعاد سوچ ہے۔ تدریج کا مطلب ہے کہ داعی فوری نتیجے کے بجائے پائیدار تبدیلی کو مقصد بنائے اور ہر مرحلے کو اگلے مرحلے کی بنیاد سمجھے۔ پانچویں رہنمائی یہ ہے کہ تدریج حق کو چھپانے یا اس میں کمی کرنے کا نام نہیں؛ حرام آخر تک حرام ہی رہتا ہے، صرف اس کی مکمل پابندی کے عملی مناظر اور مخاطب کی تربیت میں ترتیب رکھی جاتی ہے۔ چھٹی رہنمائی ماحول سازی کی ہے :نماز کی پابندی اور نیک صحبت جیسی عادتیں پہلے پیدا کی جائیں تو بڑے گناہ چھوڑنا بعد میں آسان ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اسی تسلسل کو ایک جدول کی صورت میں بھی واضح کیا گیا ہے تاکہ تربیتی مراحل کا فرق سامنے رہے۔ آج کے داعی کے لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکول کے بچے، نومسلم، یا برسوں سے بے عمل شخص، ہر ایک کے لیے ایک ہی لائحہ عمل نہیں ہو سکتا۔

جدول :تربیت و دعوت میں تدریج کے مراحل

مرحلہ	مرکزی کام	مثال
پہلا مرحلہ	عقیدہ اور آخرت کی فکر پیدا کرنا	توحید، جنت و جہنم کا ذکر
دوسرا مرحلہ	بنیادی عبادات کی عادت بنانا	نماز اور ذکر کی پابندی
تیسرا مرحلہ	حلال و حرام کے احکام پر عمل	شراب اور سود وغیرہ سے اجتناب
چوتھا مرحلہ	اخلاقی کمالات اور نوافل کی ترغیب	خدمت، سخاوت اور حسنِ اخلاق

آج کے دعوتی عمل میں تدریج کا اطلاق

موجودہ دور میں تدریج کے اطلاق کی کئی صورتیں ہیں۔ نوجوانوں کی تربیت میں پہلے ان کے سوالات کا جواب اور دین سے قلبی تعلق پیدا کرنا ضروری ہے، پھر ظاہری احکام کی طرف لانا مؤثر ہوتا ہے۔ میڈیا اور سوشل رابطوں پر بھی یہی اصول کارفرما ہے کہ مختصر دعوتی مواد سے دلچسپی پیدا ہو، پھر تفصیلی دروس کی طرف رہنمائی ہو۔ اسی طرح کسی گھرانے یا ادارے کی اصلاح میں سب سے نمایاں اور بنیادی برائی کو پہلے نشانہ بنایا جائے، چھوٹی کمزوریوں میں الجھا کر اصل ہدف ضائع نہ کیا جائے۔ داعی اگر اس ترتیب کو الٹ دے، یعنی جزئیات سے آغاز کرے اور عقیدے و اخلاق کی بنیاد کمزور رہے، تو ظاہری دینداری تو پیدا ہو سکتی ہے مگر پہلی آزمائش میں وہ قائم نہیں رہتی۔

یہ بھی یاد رہے کہ تدریج فرد کے ساتھ ساتھ معاشرے پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ جو طویل عرصے سے کسی نظام میں ڈھلا ہوا ہو، وہاں شریعت کی مکمل دعوت پیش کرنا تو داعی کا فرض ہے، مگر عملی تبدیلی کے مراحل طے کرنا حکمت ہے۔ یہاں تدریج اور مداہنت میں فرق ملحوظ رکھنا لازم ہے؛ مداہنت اصولوں میں نرمی اور حق کی کمی بیشی ہے جو حرام ہے، جبکہ تدریج مقصد کی پوری وضاحت کے ساتھ عملی نفاذ کی ترتیب ہے جو عین نبوی طریقہ ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت اسی فرق کو واضح کرتی ہے کہ احکام آخر میں نازل ہوئے مگر اپنی پوری قوت کے ساتھ نازل ہوئے، ان میں کمی نہیں کی گئی۔ یہ باریک نکتہ ہر طالب علم کو سمجھنا چاہیے ورنہ وہ تدریج کو یا تو بے عملی کا بہانہ بنا لے گا یا شدت کا جواز ختم کر دے گا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت تدریج کو دعوت کا مستقل اصول ثابت کرتی ہے۔ روایت بتاتی ہے کہ قرآن نے پہلے عقیدہ، جنت و جہنم اور آخرت کی فکر سے دلوں کو تیار کیا، پھر حلال و حرام کے احکام نازل فرمائے، کیونکہ اچانک سخت مطالبات انسانی مزاحمت کو جنم دیتے۔ اس سے داعی کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ وہ عقیدے سے عمل کی طرف بڑھے، مطالبات کو درجہ بندی کے ساتھ پیش کرے، مخاطب کی استعداد کا لحاظ رکھے، صبر و تسلسل اختیار کرے اور حق میں کمی کیے بغیر نفاذ کی ترتیب قائم رکھے۔ یہی تدریج دعوت کو قبولیت، پائیداری اور حقیقی تبدیلی عطا کرتی ہے۔

سوال نمبر :2 بیعتِ جہاد، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا الیاسؒ کا نظریۂ عمل 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعتِ جہاد نے مولانا الیاسؒ کے نظریۂ عمل کو کس طرح تشکیل دیا؟(20)

تعارف

برصغیر کی دینی تاریخ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ) متوفی1920 ء (اور حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ) متوفی1944 ء (دو ایسے نام ہیں جن کے بغیر بیسویں صدی کی دعوتی تحریکوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ شیخ الہند دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس، آزادی کی تحریک کے رہنما اور مالٹا کی اسیری کاٹنے والے مجاہد تھے، جبکہ مولانا الیاس ان کے شاگرد و مرید اور تبلیغی جماعت کے بانی تھے جنہوں نے میوات کے بے عمل اور جاہل مسلمانوں سے اصلاح کا آغاز کیا۔ سوال کا محور یہ ہے کہ شیخ الہند سے بیعتِ جہاد نے مولانا الیاس کے نظریۂ عمل یعنی اصلاح و دعوت کے بارے میں ان کے بنیادی فلسفے کو کس طرح تشکیل دیا۔ اس جواب میں پہلے بیعت و نسبت کی وضاحت، پھر اس کے اثرات، اور آخر میں نظریۂ عمل کی نمایاں خصوصیات پیش کی جائیں گی۔

یہاں جہاد کا لفظ اپنے وسیع قرآنی مفہوم میں سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن و سنت میں جہاد کا اصل مفہوم اللہ کی رضا کے لیے اپنی پوری توانائی، وقت، مال اور جان کو حق کی سربلندی اور نفس و شیطان کی مزاحمت کے مقابلے میں صرف کرنا ہے، جس کی اعلیٰ صورت میدانِ جنگ بھی ہے اور روزمرہ کی اصلاحی جدوجہد بھی۔ شیخ الہند کی زندگی اسی جامع جہاد کا نمونہ تھی :درس گاہ میں علم، تحریک میں سیاسی جدوجہد، اور خانقاہ میں روحانی تربیت بیک وقت جاری تھی۔ مولانا الیاس نے یہ میراث اپنے شیخ سے نسبت و بیعت کے ذریعے حاصل کی اور پھر اسے عوامی اصلاح کی صورت میں ڈھالا۔ یہی منتقلی اس سوال کا مرکزی موضوع ہے۔

شیخ الہند سے نسبت و بیعت کا پس منظر

مولانا الیاس نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور حضرت شیخ الہند سے علمی و روحانی فیض پایا۔ آپ کی خانقاہ اور صحبت میں ان کے اندر دو چیزیں پختہ ہوئیں :ایک امت کے زوال کا شدید درد، اور دوسرا اس یقین کی پختگی کہ امت کی اصلاح کا راستہ قربانی اور میدانِ عمل سے ہو کر گزرتا ہے، صرف درس و تقریر سے نہیں۔ شیخ الہند کی بیعت و

ارشاد کا نظام محض رسم نہیں تھا بلکہ مرید کو ایک مقصد کے لیے تیار کرنا تھا :اللہ کی رضا، اخلاص اور امت کی خدمت۔ مالٹا کی قید اور تحریکِ ریشمی رومال کی جدوجہد نے شاگردوں کے سامنے یہ عملی نمونہ رکھ دیا تھا کہ عالم و صوفی کا اصل مقام آرام دہ خانقاہ نہیں بلکہ قربانی کا میدان ہے۔

اسی ماحول میں مولانا الیاس کا ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی اصل بیماری سیاسی غلامی سے پہلے دینی بے عملی اور جہالت ہے۔ اگر عوام کا ایمان اور عمل درست نہ ہو تو کوئی بیرونی تحریک دیرپا نتیجہ نہیں دے سکتی۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں شیخ کی جدوجہد کی روح، شاگرد کے ہاں عوامی اصلاح کی صورت اختیار کرتی ہے۔ گویا ہدف ایک رہا :امت کی زندگی اللہ کی اطاعت میں ڈھلے؛ مگر میدان بدل گیا، کیونکہ حالات بدل چکے تھے اور عام مسلمان دین کے بنیادی اعمال سے بھی دور ہو چکا تھا۔ مولانا الیاس کی بعد کی ساری زندگی اسی ایک فکر کی شرح ہے کہ پہلے فرد کا ایمان بناؤ، پھر معاشرہ خود بخود بدلے گا۔

نظریۂ عمل کی تشکیل .قربانی، خروج اور عوام سے آغاز

بیعتِ جہاد کے اثر سے مولانا الیاس کے نظریۂ عمل کی پہلی خصوصیت یہ بنی کہ اصلاح کا آغاز کتابوں اور خطبوں سے نہیں بلکہ قربانی اور نکلنے یعنی خروج سے ہوگا۔ ان کا مشہور اصول تھا کہ دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے اپنے ماحول سے نکل کر اللہ کے راستے میں وقت لگانا پڑتا ہے، کیونکہ ماحول انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ یہ عین جہاد کی روح ہے کہ گھر کا آرام چھوڑ کر مشقت کے میدان میں اترنا۔ دوسری خصوصیت عوام سے آغاز تھی :انہوں نے اصلاح کے لیے حکمرانوں یا خواص کے بجائے میوات کے غریب اور ناخواندہ کسانوں کو منتخب کیا، کیونکہ ان کے نزدیک امت کی بنیاد عوام ہیں۔ تیسری خصوصیت ایمان و یقین کی محنت کو ہر کام پر مقدم رکھنا تھا :اصل تبدیلی دلوں کے یقین بدلنے سے آتی ہے، ظاہری شکلیں خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔

چوتھی خصوصیت اجتماعی محنت کا نظام تھا۔ جہاد جس طرح انفرادی عمل نہیں بلکہ امیر کی قیادت، جماعت کی تنظیم اور باہمی مشورے سے ہوتا ہے، اسی طرح مولانا الیاس نے دعوت کو بھی جماعت، مشورے اور اصولوں کی پابندی کے ساتھ منظم کیا۔ پانچویں خصوصیت خود کو مٹا کر کام کرنا تھا :شیخ الہند کی طرح وہ بھی نام و نمود سے دور رہے اور ہر کامیابی کو اللہ کی طرف منسوب کیا۔ چھٹی خصوصیت مسلکی و گروہی تنازعات سے اجتناب اور امت

کو کلمے کی بنیاد پر جوڑنا تھا، تاکہ محنت کی توانائی آپسی لڑائیوں میں ضائع نہ ہو۔ ان تمام خصوصیات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیعت سے حاصل شدہ جہاد کا مزاج، یعنی اخلاص، قربانی، استقامت اور مقصد پر نظریں، ہی مولانا الیاس کے دعوتی نظام کی بنیاد بن گیا۔

نظریۂ عمل کے عملی ثمرات اور تنقیدی توازن

اس نظریۂ عمل کا پہلا ثمر یہ نکلا کہ دعوت علما کی مجلسوں سے نکل کر عام آدمی کی سرگرمی بن گئی۔ ہر مسلمان کو داعی سمجھا جانے لگا اور دین کی محنت چند مخصوص لوگوں کی اجارہ داری نہ رہی۔ دوسرا ثمر یہ ہوا کہ عمل پر زور دینے سے ان علاقوں میں نماز، مساجد کی آبادی اور دینی شعور میں نمایاں تبدیلی آئی جہاں پہلے نام کے مسلمان بھی اعمال سے بالکل ناواقف تھے۔ تیسرا ثمر یہ تھا کہ یہ تحریک سیاسی اقتدار کے بغیر خالص دینی محنت سے دنیا بھر میں پھیل گئی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نظریۂ عمل میں اخلاص اور قربانی شامل ہو تو وسائل کی کمی رکاوٹ نہیں بنتی۔ یہ سب اسی بیعت و نسبت کی برکت تھی جس نے ایک فرد کے دل میں امت کا درد اور میدانِ عمل کی ہمت پیدا کر دی تھی۔

ساتھ ہی علمی توازن کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے کو غیر مشروط تقدیس کے بجائے اصولی نگاہ سے دیکھا جائے۔ مولانا الیاس کا نظریۂ عمل اپنے مخصوص حالات کا جواب تھا؛ اس کی اصل قدر اس کے اصولوں میں ہے، یعنی اخلاص، قربانی، تدریج، عوامی شرکت اور ایمان کی محنت۔ ہر دور کے داعی کو یہ اصول اپنے حالات پر منطبق کرنا ہوں گے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شیخ الہند سے لے کر مولانا الیاس تک اس سلسلے کی کامیابی کی اصل کنجی شخصیات کی سادگی اور بے لوثی تھی، کوئی دنیوی نظام یا دولت نہیں۔ طالب علم کے لیے اس تاریخی مثال کا سبق یہ ہے کہ دعوت کا نظریہ کتابوں سے ضرور بنتا ہے، مگر اس کا مزاج کسی مردِ حق کی صحبت اور قربانی کے ماحول سے ملتا ہے، اور یہی مزاج نظریے کو زندہ تحریک میں بدلتا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند سے بیعت و نسبت نے مولانا الیاس کے نظریۂ عمل کو تین بنیادی رخ عطا کیے : مقصد کی وضاحت کہ امت کی اصل اصلاح ایمان و عمل کی درستگی ہے، طریقے کی قربانی کہ اس کے لیے گھر بار چھوڑ کر

میدان میں نکلنا اور وقت لگانا پڑے گا، اور مزاج کی تشکیل کہ اخلاص، استقامت، خود کو مٹانا اور امت کا درد اس محنت کی روح ہوگی۔ اسی سے عوام سے آغاز، خروج، جماعتی نظم اور کلمے کی بنیاد پر اتحاد جیسی خصوصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے میوات کی ایک مقامی اصلاح کو عالمگیر دعوتی تحریک میں بدل دیا۔ یوں بیعتِ جہاد یہاں ایک ظاہری رسم نہیں بلکہ ایک فکری و عملی وراثت کی منتقلی کا نام ہے۔

سوال نمبر :3 کلم کی شدت و قوت اور مکالمے کا مفہوم :نواب صدیق حسن خان کی رائے

20)نمبر(

سوال نمبر3 ۔ نواب صدیق حسن خان کی رائے کے مطابق" کلم" کی شدت و قوت مکالمے کے مفہوم پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟(20)

تعارف

انسانی گفتگو کا دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے، اور الفاظ کا اثر صرف ان کے لغوی معنی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے لہجے، شدت اور قوت سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ برصغیر کے نامور عالم، نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ) متوفی1890 ء(، جو ریاست بھوپال کے معروف علمی و دینی رہنما اور اہلِ حدیث مکتب کے ممتاز مصنف تھے، نے کلام اور مکالمے کی بحث میں اسی نکتے کو اجاگر کیا ہے کہ کلم یعنی بولا ہوا لفظ و جملہ اپنی شدت اور قوت کے اعتبار سے مکالمے کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ سوال کا مقصد اسی رائے کی وضاحت ہے کہ ایک ہی بات نرم لہجے میں کہی جائے تو نصیحت بنتی ہے اور سخت شدت کے ساتھ کہی جائے تو جھگڑا بن جاتی ہے۔ اس جواب میں پہلے کلم اور مکالمے کے مفاہیم، پھر شدت و قوت کی اقسام، اور آخر میں ان کے مفہوم پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

اس موضوع کی اہمیت آج کے دور میں اور بڑھ گئی ہے، کیونکہ معاشرے کی زیادہ تر خرابیاں زبان کے بے قابو استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اچھے کلمے کو ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں، اور برے کلمے کو ناپاک درخت سے جو زمین سے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ اس قرآنی تمثیل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کی زندگی اس کی معنوی قوت میں ہے۔ نواب صاحب کی رائے اسی قرآنی نظر کی تفصیل ہے کہ

مکالمے کو صرف الفاظ کی فہرست نہ سمجھا جائے بلکہ ان الفاظ کی شدت، وزن اور اندرونی طاقت کو بھی مفہوم کا حصہ مانا جائے۔

کلم، شدت و قوت اور مکالمے کے مفاہیم

کلم کا لفظی مادہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بولا ہوا لفظ سننے والے کے دل پر ایک اثر اور نشان چھوڑتا ہے؛ اسی لیے زخم کو بھی اسی سے ملتا جلتا مفہوم دیا گیا ہے کہ تیز بات دل کو زخمی کر دیتی ہے۔ اصطلاحی طور پر کلم سے مراد وہ بامعنی گفتگو ہے جو بولنے والے کے ارادے کو ظاہر کرے۔ شدت سے مراد لفظ و لہجے کی سختی، تیزی اور زور ہے، جو نرمی کی ضد ہے، جبکہ قوت سے مراد کلام کا معنوی وزن، دلیل کی پختگی اور بولنے والے کے یقین و اخلاص سے پیدا ہونے والا اثر ہے۔ مکالمہ دو فریقوں کے درمیان سوالات و جوابات اور خیالات کے تبادلے کو کہتے ہیں، جس کا مقصد ایک دوسرے کو سمجھنا اور حق تک پہنچنا ہوتا ہے، محض غالب آنا نہیں۔ ان مفاہیم کو ملا کر دیکھا جائے تو رائے کی صورت یہ بنتی ہے کہ مکالمے کا مفہوم دراصل الفاظ، لہجے اور نیت تینوں کی مجموعی پیداوار ہوتا ہے۔

نواب صاحب کے طرزِ استدلال کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ کے شرعی و لغوی وزن کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک بے وزن، پھیکے اور غیر ذمہ دارانہ الفاظ مکالمے کو محض شور بنا دیتے ہیں، جس سے نہ مسئلہ حل ہوتا ہے اور نہ دل قریب آتے ہیں۔ اس کے برعکس جب بولنے والے کے الفاظ میں علمی وزن ہو، اس کا لہجہ موقع کے مطابق ہو اور اس کے دل میں مخاطب کی خیرخواہی ہو، تو وہی الفاظ دلوں کو جوڑ دیتے ہیں۔ گویا مکالمہ ایک عمارت ہے جس کی اینٹیں الفاظ ہیں، مگر اس کی مضبوطی کا انحصار اس مسالے پر ہے جسے شدت اور قوت کہا جاتا ہے۔ یہی پیمانہ آگے آنے والے اثرات کو سمجھنے کی بنیاد ہے۔

شدت کا مکالمے کے مفہوم پر اثر

شدت کا پہلا اثر لفظ کے مفہوم کی تبدیلی ہے۔ ایک ہی جملہ اگر نرمی سے کہا جائے تو وہ تنبیہ اور نصیحت سمجھا جاتا ہے، اور وہی جملہ چیخ کر یا طنز کے ساتھ کہا جائے تو توہین اور اعلانِ جنگ بن جاتا ہے۔ سننے والا اس صورت میں اصل بات کو نہیں، اپنے زخمی انا کو لے کر ردِ عمل دیتا ہے، یوں مکالمے کا مقصد ختم اور جھگڑے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے پاس بھیجا تو بھی نرم بات

کہنے کا حکم دیا کہ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ اگر شدت حق بات کو بھی بے اثر کر سکتی ہے تو پھر ناحق بات کا انجام اس سے بدتر ہوگا۔ نواب صاحب کی رائے کا عملی حاصل یہی ہے کہ شدت بڑھنے سے مفہوم اپنی اصل صورت سے ہٹتا جاتا ہے۔

شدت کا دوسرا اثر مخاطب کی نفسیاتی کیفیت پر پڑتا ہے۔ سخت کلم سننے والے کے دل میں خوف، غصہ یا ضد پیدا کرتا ہے؛ خوف زدہ شخص وقتی طور پر خاموش تو ہو جاتا ہے مگر قائل نہیں ہوتا، اور ضدی شخص جواب میں اس سے بڑھ کر سختی اختیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس موقع محل کے مناسب پختگی، یعنی بات کو پوری قوت مگر شائستہ لہجے میں کہنا، مخاطب کو سوچنے پر مائل کرتا ہے۔ توازن یہ ہے کہ نرمی کا مطلب کمزوری اور مداہنت نہیں ہے؛ حق بات کو واضح اور دو ٹوک کہنا بھی قوت ہے، مگر اس میں ذاتی حملہ، تحقیر اور چیخ و پکار شامل نہ ہو۔ یہی وہ حد ہے جہاں شدت مفہوم کو بگاڑتی ہے اور متوازن قوت مفہوم کو نکھارتی ہے۔

قوت کا مکالمے کے مفہوم پر اثر

قوت سے مراد صرف آواز کی بلندی نہیں بلکہ کلام کی معنوی طاقت ہے۔ اس قوت کے تین سرچشمے ہیں :پہلا علم و دلیل، کہ بولنے والا جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کے پاس اپنی بات کی بنیاد موجود ہو۔ دوسرا اخلاص و یقین، کہ بولنے والے کو خود اپنی بات پر اعتماد ہو اور اس کی نیت مخاطب کی اصلاح ہو۔ تیسرا کردار کی گواہی، کہ بولنے والے کی زندگی اس کے کلام کی تصدیق کرتی ہو۔ جب یہ تینوں جمع ہو جائیں تو سادہ لفظ بھی دلوں میں اتر جاتا ہے، اور جب یہ نہ ہوں تو بڑے بڑے الفاظ بھی کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کی یہ رائے دعوت کے میدان میں خاص طور پر اہم ہے، کیونکہ داعی کا مکالمہ اگر کمزور دلیل اور کھوکھلے لہجے پر ہو تو مدعو اسے سنجیدہ نہیں لیتا۔

اس کے علاوہ قوت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ وہ مکالمے کی سمت متعین کرتی ہے۔ طاقتور کلم توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، بحث کو غیر متعلق موضوعات میں بھٹکنے نہیں دیتا اور فریقین کو اصل نکتے پر رکھتا ہے۔ اسی لیے قرآنی اسلوب میں مختصر مگر پُر وزن جملے عام ملتے ہیں جو صدیوں سے دلوں پر اثر انداز ہیں۔ البتہ یہ قوت اگر انا اور فخر کے ساتھ مل جائے تو وہی کلم تکبر کا اظہار بن کر اثر کھو دیتا ہے۔ پس اصل کمال یہ ہے کہ قوت حق کی ہو، دلیل کی

ہو اور اخلاص کی ہو، شخصیت کے رعب کی نہ ہو۔ نواب صدیق حسن خان کی بحث کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ مکالمے کا مفہوم لفظ کے لغوی معنی سے کہیں بڑھ کر اس قوت و شدت سے متشکل ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ ادا کیا گیا ہو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خان کی رائے کے مطابق کلم کی شدت و قوت مکالمے کے مفہوم کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ غیر متوازن شدت بات کو نصیحت سے توہین میں، اور سوال کو جھگڑے میں بدل دیتی ہے، جبکہ علم، اخلاص اور کردار سے پیدا ہونے والی قوت سادہ الفاظ کو بھی مؤثر اور دل نشین بنا دیتی ہے۔ اس لیے کامیاب مکالمے کے لیے ضروری ہے کہ حق بات پوری قوت سے، مگر موقع محل کے مطابق شائستہ شدت کے ساتھ کہی جائے۔ یہی اصول مناظرے، تدریس اور روزمرہ گفتگو، تینوں میں کارفرما ہے، اور یہی اس سوال کا بنیادی جواب ہے۔

سوال نمبر :4 لکھا ہوا مواد پڑھ کر سنانا تقریر کیوں نہیں؟ دعوت کی تاثیر پر اثرات (نمبر20)

سوال نمبر4 ۔ لکھے ہوئے مواد کو پڑھ کر سنانا تقریر کیوں نہیں کہلاتا، اور اس سے دعوت کی تاثیر کس طرح کم ہوتی ہے؟(20)

تعارف

خطابت و تقریر دعوت کے قدیم ترین اور مؤثر ترین ذرائع میں سے ہے، مگر ہر وہ آواز جو مائیک سے نکلے تقریر نہیں بن جاتی۔ سوال یہ ہے کہ لکھے ہوئے مواد کو پڑھ کر سنانا تقریر کیوں نہیں کہلاتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریر کا جوہر زندہ خطاب ہے :خطیب سامعین کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے دل و دماغ سے بات کرتا ہے، ان کی آنکھوں میں دیکھتا ہے، ان کے تاثرات کے مطابق لہجہ بدلتا ہے اور اپنے جذبات کو ان تک منتقل کرتا ہے۔ اس کے برعکس تحریر پڑھنے والا اپنی نظر کاغذ پر جمائے رکھتا ہے، اس کی آواز میں یکسانیت آ جاتی ہے اور وہ دراصل تحریر کو آواز دے رہا ہوتا ہے، سامعین سے کلام نہیں کر رہا ہوتا۔ اس جواب میں پہلے تقریر کی تعریف و ارکان، پھر پڑھنے اور تقریر کا فرق، اور آخر میں اس سے دعوت کی تاثیر کم ہونے کی وجوہات بیان کی جائیں گی۔

یہ واضح رہے کہ تحریر کی تیاری کو اس بحث میں غلط نہیں کہا جا رہا۔ ہر اچھا خطیب اپنی تقریر سے پہلے مطالعہ کرتا ہے، نکات لکھتا ہے اور بعض حساس مقامات کے الفاظ بھی منتخب کرتا ہے۔ بحث اس کیفیت کے بارے میں ہے جس میں مقرر پوری تقریر کاغذ سے پڑھتا ہے اور سامعین سے اس کا کوئی زندہ تعلق قائم نہیں ہوتا۔ فقہ الدعوہ کی کتابوں میں اس کو اسی لیے کمزور درجہ دیا گیا ہے کہ دعوت دلوں کا کام ہے، اور دلوں تک رسائی زندہ رابطے کے بغیر ممکن نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے خطبات مختصر، جاندار اور موقع و محل کے عین مطابق ہوتے تھے؛ آپ ﷺ سامعین کو ان کی کیفیت کے مطابق مخاطب فرماتے تھے۔ اسی نبوی اسلوب کی روشنی میں اس سوال کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔

تقریر کی تعریف اور اس کے بنیادی ارکان

تقریر سے مراد وہ زبانی خطاب ہے جو کسی مقصد کے تحت حاضر سامعین کے سامنے فی البدیہہ یا تیار شدہ نکات کی بنیاد پر اس طرح پیش کیا جائے کہ سامعین کی عقل و دل دونوں خطیب کے ساتھ شریک ہوں۔ اس کے بنیادی ارکان چار ہیں : خطیب، سامعین، موضوع، اور ان سب کو جوڑنے والا زندہ ابلاغ۔ زندہ ابلاغ سے مراد آنکھوں کا رابطہ، آواز کا اتار چڑھاؤ، مناسب وقفے، اشارے اور سامعین کے تاثرات کے مطابق بات کو بڑھانا یا سمیٹنا ہے۔ اسی ابلاغ سے تقریر ایک تقریب نہیں رہتی بلکہ ایک واقعہ بن جاتی ہے جس میں سننے والا خود کو شامل سمجھتا ہے۔ اگر یہ عنصر نکال دیا جائے تو باقی صرف تحریر پڑھنا رہ جاتا ہے، چاہے تحریر کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ تقریر میں خطیب کی شخصیت اور کیفیت جزءِ لازم ہے۔ اس کی سنجیدگی، درد اور یقین اس کی آواز سے جھلکتا ہے، اور سامعین اس کیفیت کو محسوس کر کے متاثر ہوتے ہیں۔ اداکار اور خطیب میں یہی فرق ہے کہ خطیب اپنے احساس کو منتقل کرتا ہے جبکہ صرف پڑھنے والا الفاظ کو منتقل کرتا ہے۔ انسانی نفسیات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ہم سے مخاطب ہوں، نہ کہ ان سے جو ہمارے سامنے کسی اور چیز میں مشغول ہوں۔ کاغذ پڑھنے والا خطیب عملاً سامعین کو یہ پیغام دے رہا ہوتا ہے کہ میرے لیے کاغذ تم سے زیادہ اہم ہے۔ ایسی صورت میں اس کی بات کی مقبولیت پہلے ہی قدم پر کمزور پڑ جاتی ہے۔

پڑھ کر سنانے سے تقریر کے ارکان میں پیدا ہونے والی کمزوریاں

پڑھ کر سنانے کی پہلی کمزوری آنکھوں کے رابطے کا خاتمہ ہے۔ جب خطیب کی نظر مسلسل کاغذ پر ہو تو سامعین اس سے ذہنی رابطہ کھو دیتے ہیں، ان کی توجہ منتشر ہونے لگتی ہے اور مجلس رفتہ رفتہ بے جان ہو جاتی ہے۔ دوسری کمزوری لہجے کی یکسانیت ہے :تحریر کا جملہ خواہ کسی جذبے کا ہو، پڑھنے کی رفتار ایک جیسی رہتی ہے، جس سے نشیب و فراز، سوال و جواب کی کیفیت اور تاکید کے مقامات، سب برابر ہو جاتے ہیں۔ تیسری کمزوری وقتی حالات سے بے خبری ہے :زندہ خطیب کسی آواز، حرکت یا سامعین کی تھکن دیکھ کر اپنی بات میں مثال، لطیفہ یا وقفہ شامل کر لیتا ہے، جبکہ پڑھنے والا اپنے لکھے ہوئے سلسلے سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ چوتھی کمزوری یہ ہے کہ غلطی یا رکاوٹ کی صورت میں پڑھنے والا لائن گم کر بیٹھتا ہے اور پورا ربط ٹوٹ جاتا ہے۔

پانچویں اور سب سے گہری کمزوری اعتماد کی ہے۔ سامعین محسوس کرتے ہیں کہ مقرر اس موضوع کا مالک نہیں ہے، وہ کسی اور کی تحریر یا اپنی ہی تیاری کا محتاج ہے۔ دعوت میں یہ احساس خاص طور پر نقصان دہ ہے، کیونکہ مدعو داعی کو اس موضوع کا زندہ گواہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جس داعی کے پاس اپنے پیغام کی اتنی پختگی نہ ہو کہ وہ چند نکات کی مدد سے اسے بیان کر سکے، اس کے پیغام کی صداقت پر بھی سوال اٹھتا ہے، چاہے یہ سوال غیر منصفانہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بلاغت کے ماہرین تیاری کو زیادہ اور انحصار کو کم کرنے کی تلقین کرتے ہیں :پورا مطالعہ گھر پر ہو، مگر منبر پر خود خطیب ہو، کاغذ نہیں۔ اسی توازن سے تقریر بھی رہتی ہے اور تیاری کی برکت بھی حاصل ہوتی ہے۔

دعوت کی تاثیر کم ہونے کے اسباب اور اس کا علاج

دعوت کی تاثیر کم ہونے کا پہلا سبب دلوں کی عدم شرکت ہے۔ دعوت کی کامیابی کا پیمانہ یہ نہیں کہ کتنی معلومات سنائی گئیں بلکہ یہ ہے کہ کتنے دلوں نے قبولیت کا فیصلہ کیا۔ پڑھی ہوئی تقریر کانوں تک پہنچتی ہے، دل تک کم ہی پہنچ پاتی ہے، کیونکہ اس میں وہ حرارت موجود نہیں ہوتی جو دل سے نکل کر دل میں اترتی ہے۔ دوسرا سبب وقت کی بربادی اور اکتاہٹ ہے :سامعین خاص طور پر نوجوان نسل، یکساں پڑھائی سے جلد اکتا جاتے ہیں اور موبائل یا آپسی گفتگو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یوں وہ حصہ بھی ضائع ہو جاتا ہے جو اچھا تھا۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ پڑھنے والا

داعی سامعین کے سوالات اور نفسیات کو محسوس ہی نہیں کر پاتا، اس لیے اس کی دعوت ان کی اصل ضرورت سے کٹی رہتی ہے۔

اس کا علاج یہ نہیں کہ لکھنا چھوڑ دیا جائے بلکہ لکھنے کا محل بدل دیا جائے۔ داعی مطالعہ کر کے نکات مرتب کرے، مشکل مقامات کے الفاظ یاد کرے، مگر تقریر کے وقت نکات کو بنیاد بنا کر اپنی زبان میں بات کرے۔ آغاز سامعین سے براہِ راست مخاطب ہو کر کرے، درمیان میں ان کے تاثرات دیکھتا رہے، اور اختتام کسی دعوے پر نہیں بلکہ ایک واضح عمل کی دعوت پر کرے۔ اسی طرح آواز کی مشق، وقفوں کا صحیح استعمال اور مختصر جملوں کی عادت بھی تقریر کو زندہ بناتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تحریر تقریر کی خادم ہے، مالک نہیں؛ جہاں خادم مالک بن جائے وہاں دعوت کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ لکھے ہوئے مواد کو پڑھ کر سنانا اس لیے تقریر نہیں کہلاتا کیونکہ اس میں تقریر کا جوہر، یعنی زندہ خطاب، آنکھوں کا رابطہ، لہجے کا اتار چڑھاؤ اور سامعین کے ساتھ ذہنی و جذباتی شرکت، موجود نہیں ہوتا۔ اس سے دعوت کی تاثیر اس طرح کم ہوتی ہے کہ دلوں کی شرکت ختم ہو جاتی ہے، سامعین اکتا کر توجہ کھو دیتے ہیں، داعی کی علمی ملکیت اور صداقت پر اعتماد کمزور پڑتا ہے اور پیغام اصل ضرورت سے کٹ جاتا ہے۔ اس کا علاج تیاری ترک کرنا نہیں بلکہ تیاری کو نکات تک محدود رکھ کر تقریر کو زندہ خطاب بنانا ہے، کیونکہ دعوت دل سے دل کا سفر ہے اور یہ سفر پڑھے ہوئے کاغذ سے طے نہیں ہوتا۔

سوال نمبر :5 تفسیر القرآن بالقرآن :درسِ قرآن کے لیے اس اصول کی بنیادی حیثیت 20) نمبر(

سوال نمبر5 ۔ درسِ قرآن کے لیے تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کو بنیادی حیثیت کیوں دی جاتی ہے؟(20)

تعارف

تفسیر کے اصولوں میں سب سے پہلا اور سب سے مضبوط اصول تفسیر القرآن بالقرآن ہے، یعنی قرآن کے کسی مقام کی تشریح خود قرآن کے دوسرے مقام سے کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو بات ایک جگہ مختصر یا مجمل آئی ہے، اس کی تفصیل دوسری جگہ مل جاتی ہے؛ جو حکم ایک مقام پر مطلق ہے، دوسرے مقام پر اس کی قید موجود ہے؛ اور جو لفظ ایک آیت میں مبہم ہے، دوسری آیت اسے کھول دیتی ہے۔ درسِ قرآن دینے والے کے لیے اس اصول کو بنیادی حیثیت اس لیے دی جاتی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کلام کا سب سے معتبر شارح خود وہی کلام ہے۔ اس جواب میں پہلے اس اصول کی تعریف و اقسام، پھر اس کی بنیادی حیثیت کی وجوہات، اور آخر میں درسِ قرآن میں اس کے عملی فائدے بیان کیے جائیں گے۔

یہ مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ درسِ قرآن عام طور پر عام سامعین کے سامنے دیا جاتا ہے جن کے پاس تحقیق کا موقع نہیں ہوتا؛ وہ مدرس کی بات کو ہی قرآن کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اگر مدرس اپنی رائے، قصے کہانیوں یا کمزور روایات کو بنیاد بنا لے تو غلط مفاہیم نسل در نسل منتقل ہونے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس جو درس قرآنی آیات کو قرآنی آیات سے جوڑ کر پیش کرتا ہے، اس میں اعتماد، توازن اور وحدتِ مفہوم پیدا ہوتی ہے۔ مفسرین نے اتفاق کیا ہے کہ تفسیر کی ترتیب میں پہلا درجہ قرآن سے تفسیر کا، دوسرا سنت کا، پھر اقوالِ صحابہ اور پھر اجتہاد کا ہے۔ اسی ترتیب کی روح اس سوال میں پوچھی گئی ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کی صورتیں

اس اصول کی پہلی صورت مجمل کی تفصیل ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الانعام میں فرمایا گیا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہ ملایا، ان کے لیے امن ہے۔ یہاں ظلم کا مفہوم مجمل تھا، صحابہ کو تشویش ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے سورۃ لقمان کی آیت پیش فرمائی کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے، یوں قرآن نے خود اپنے مجمل کو واضح کر دیا۔ دوسری صورت مطلق کی تقیید ہے :کسی حکم کا عام ذکر ایک جگہ اور اس کی شرائط دوسری جگہ بیان ہوئی ہیں۔ تیسری صورت عام کی تخصیص ہے، چوتھی صورت مبہم لفظ کی تعین، اور پانچویں صورت ایک آیت کے مضمون

کی تائید میں دوسری آیات کا ذکر ہے جنہیں نظائر کہا جاتا ہے۔ ان صورتوں کے مجموعے سے قرآن ایک مربوط نظام بن کر سامع کے سامنے آتا ہے۔

اسی سے جڑی ایک صورت یہ ہے کہ قرآن اپنے قصوں کی تفصیل بھی خود ہی مختلف مقامات پر پوری کرتا ہے۔ کسی نبی کا واقعہ ایک سورت میں اجمالاً آتا ہے اور دوسری سورت میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں؛ دونوں کو ملانے سے مکمل تصویر بنتی ہے۔ درس دینے والا اگر صرف ایک ٹکڑے کو لے کر بیان کرے تو سامعین کے ذہن میں ادھوری یا غلط تصویر بن سکتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ تفسیر با قرآن کا مطلب یہ نہیں کہ ہر آیت کی لازماً کوئی دوسری شارح آیت موجود ہو؛ جہاں قرآن خود خاموش ہو وہاں سنت و آثار کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اصول کی بنیاد یہ ہے کہ آغاز ہمیشہ قرآن سے ہوگا اور کوئی تفسیر قرآن کے کسی دوسرے واضح مفہوم سے ٹکرائے گی نہیں۔

اس اصول کی بنیادی حیثیت کی وجوہات

پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو ہدایت، فرقان اور ہر چیز کا بیان قرار دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ جب اصل متن محفوظ اور خود مبیّن ہے تو اس کی تشریح میں اسی کو مقدم رکھنا عقل و نقل دونوں کا تقاضا ہے۔ دوسری وجہ اعتماد و یقین ہے :داعی یا مدرس جب سامعین کو بتاتا ہے کہ اس مفہوم کی دلیل خود قرآن کی فلاں آیت ہے تو بات دو نصوص کے باہمی اتفاق سے ثابت ہوتی ہے، اور کسی شخصی رائے کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ تیسری وجہ غلط فہمیوں سے حفاظت ہے :بہت سی گمراہیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ ایک آیت کو اس کے قرآنی سیاق اور دوسری آیات سے کاٹ کر پیش کیا گیا۔ تفسیر بالقرآن اس کاٹنے کو ناممکن بنا دیتا ہے، کیونکہ ہر دعوے کو پورے قرآن کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔

چوتھی وجہ وحدت و ہم آہنگی کا اثبات ہے۔ قرآن میں بظاہر مختلف نظر آنے والے بیانات کو اس اصول سے جمع کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ ہر مقام کا اپنا سیاق اور مقصد ہے۔ یہ تجربہ سامعین کے ایمان کو بڑھاتا ہے۔ پانچویں وجہ عملی آسانی ہے :درسِ قرآن کے سامعین کے لیے آیات کا آپس میں ربط دیکھنا یاد رکھنے میں بھی آسان ہوتا ہے اور عمل کی صورت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے اسی طریقے پر قرآن کی تشریح فرمائی ہے، جیسا کہ ظلم کی تفسیر کی مثال اوپر گزری؛ یوں یہ اصول نبوی طریقِ تدریس کی

اتباع بھی ہے۔ ان وجوہات کے مجموعے سے یہ اصول تفسیر کی عمارت کی بنیاد بن جاتا ہے، جس کے بغیر اوپر کی تمام منزلیں غیر محفوظ ہو جاتی ہیں۔

درسِ قرآن میں اس اصول کے عملی فائدے اور حدود

درسِ قرآن میں اس اصول کو اپنانے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ درس محض تقریر نہیں رہتا بلکہ قرآن سے قرآن کا تعارف بن جاتا ہے؛ سامعین کے دل میں قرآن کی عظمت اور اس کے مربوط ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مدرس اختلافی اور فروعی بحثوں میں الجھنے کے بجائے سامعین کو قرآنی ہدایت کے اصل مراکز سے جوڑتا ہے، جو درس کا اصل مقصد ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ نئے سوالات کا جواب تلاش کرنے کا ایک محفوظ طریقہ سامنے آتا ہے :پہلے موضوع سے متعلق تمام آیات جمع کی جائیں، پھر ان کی مجموعی روشنی میں نتیجہ نکالا جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے موضوعی مطالعہِ قرآن بھی کہا جاتا ہے اور جدید دور کے بہت سے سوالات کا جواب اسی سے ملتا ہے۔

اس کے ساتھ اس اصول کی حدود کو بھی سمجھنا ضروری ہے تاکہ بنیادی حیثیت کا مطلب غلط نہ لیا جائے۔ بنیادی حیثیت کا مطلب یہ نہیں کہ سنت کی ضرورت ختم ہو گئی؛ قرآن کے بہت سے احکام، مثلاً نماز کی رکعات اور زکاۃ کا نصاب، سنت ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح عربی لغت، شانِ نزول اور اقوالِ صحابہ بھی تفسیر کے معاون ذرائع ہیں۔ ترتیب صرف یہ ہے کہ درجہ اول قرآن کو حاصل ہے، اس کے بعد سنت، پھر آثار، اور آخر میں اجتہاد و رائے کو، بشرطیکہ وہ پہلے درجات سے نہ ٹکرائے۔ جو مدرس اس ترتیب کو توڑ کر صرف رائے یا صرف روایات پر درس بنا لیتا ہے، اس کا درس بنیاد سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی توازن اس اصول کی اصل تعلیم ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ درسِ قرآن کے لیے تفسیر القرآن بالقرآن کو بنیادی حیثیت اس لیے دی جاتی ہے کہ قرآن اللہ کا محفوظ کلام ہے اور اپنے مفہوم کا سب سے معتبر شارح خود ہے۔ اس کی صورتیں مجمل کی تفصیل، مطلق کی تقیید، عام کی تخصیص اور نظائر کی تائید ہیں، اور اس کی وجوہات میں اعتماد، غلط فہمیوں سے حفاظت، قرآنی ہم آہنگی کا اثبات اور طریقِ نبوی کی اتباع شامل ہے۔ اس اصول کو اپنانے سے درسِ قرآن رائے و قصوں کے بجائے دلیل و ہدایت کا درس بنتا ہے اور

سامعین کا قرآن سے زندہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ البتہ اس بنیاد کے بعد سنت، لغت اور آثار کا درجہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے، اور یہی ترتیب تفسیر کے علم کی روح ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com